ہندوستان میں عزاداری کی روایت اور مسلکی تنازعے

سیوان[1] (بہار) کا ایک خصوصی مطالعہ

پرویز نذیر☆

اس مقالے میں انیسویں اور بیسویں صدی میں ہندوستان کی سیاسی صورت حال میں عزاداری کی روایات خصوصاً اس سلسلے میں سنّی، شیعہ مسلکی ٹکراؤ کے حوالے سے، کچھ تجزیہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ہندوستان میں عزاداری کی روایت صرف شیعوں تک ہی محدود نہیں ہے، اسے بہت تقدس و احترام کے ساتھ سنّی لوگ بھی مناتے ہیں۔ ملک کے کچھ حصوں خصوصاً بہار، اتر پردیش گجرات، دکن وغیرہ میں عزاداری کے سلسلے میں نظر آنے والی جذباتی شدت قابل توجہ ہے اور اس نے کچھ عالموں (محققوں) کی توجہ کو مبذول بھی کیا ہے۔

بنو امیہ اور بنو عباس کی طرف سے ایذا رسانی کے ہراس (Persicution complex) اور بے جا جانبداری کے اپنے خیالی تصور (Perceived discrimination) کے تحت شیعوں نے دنیا کے مختلف حصوں کی طرف ہجرت کی۔

انہیں ہندوستان میں کسب معاش کے لیے بہترین سیاسی ماحول نظر آیا اس لیے یہ ایک ایک، دو دو کرکے یا گروہ کی شکل میں آہستہ آہستہ ادھر بڑھ آئے۔ یہ ہندوستان میں اس دور میں پھلے پھولے جب ایران میں صفوی خاندان کی حکومت تھی۔ اپنے ایرانی رشتوں کے اثر سے شیعوں نے جلد ہی، خصوصاً جنوبی ہندوستان میں، خود کو ممتاز حکمراں طبقے میں بدل لیا۔ یہیں بہمنی سلطنت کے انتشار کے بعد کئی شیعہ حکومتیں وجود میں آئیں۔[2]

گو کہ مغل زیادہ تر سنّی ہی تھے مگر ان کے درباروں میں سیاسی تقاضوں اور کسی حد تک ایرانی ثقافتی اثرات کی وجہ سے، شیعہ اثرات کا مرتب ہونا بالکل ناممکن بھی نہیں تھا۔ براؤن، ای۔جی۔ نے لکھا ہے:

☆ شعبۂ تاریخ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

۱۔ سیوان شمالی بہار کا ایک ضلع ہے جسے سارن ضلع سے الگ کرکے ضلع بنایا گیا ہے۔ یہاں مسلمان آبادی کی تعداد کافی ہے۔ گو کہ ان میں سنیوں کی اکثریت ہے مگر بعض جگہ شیعہ بھی غالب حیثیت رکھتے ہیں۔

۲۔ موجان مینن: این انٹروڈکشن ٹو شیعی اسلام، دی ہسٹری اینڈ ڈوکٹرائنس آف ٹوولور شیعی ازم، ص ۱۲۰

''خواہ عقیدے، خواہ پالیسی کے تحت بابر نے شیعوں کے لیے کافی طرفداری کا مظاہرہ کیا جس کے نتیجے میں اس کی وسط ایشیائی رعیت میں بہت بیزاری پیدا ہوئی'' [1]

اپنی چھنی ہوئی ریاست فرغانہ کو دوبارہ حاصل کر لینے اور ہندوستان کو فتح کرنے کی جدو جہد میں ایران کے حکمراں شاہ اسماعیل نے بابر کی حمایت کی تھی۔ اسی اثر کے تحت اس نے اپنے دربار میں کچھ شیعہ روایات شروع کی تھیں۔[2] ہمایوں اور اکبر کی مائیں، دونوں ایرانی النسل تھیں، ہمایوں جب ہندوستان سے نکلا اور اس کے بھائیوں نے بھی اس کا ساتھ چھوڑا تو اس نے ایران کے شاہ عباس کے دربار میں ہی پناہ لی۔ اکبر کے دربار میں بھی بہت سے با اثر امراء جو کم عمر بادشاہ کے ذہن پر گہرا اثر ڈال سکتے تھے شیعہ تھے۔ بیرم خان بھی ان میں سے ایک تھا۔ ابوالفضل، اس کا باپ شیخ مبارک اور بھائی فیضی وہ ممتاز شخصیتیں تھیں جو اس کے دربار کی زینت تھیں۔

جس وقت اورنگ زیب کے دور میں دکن کی شیعہ سلطنتیں تیزی سے رو بہ تنزل تھیں۔ شمالی ہندوستان میں اودھ، جس کا مرکز لکھنؤ تھا، شیعی مراکز میں اہم ہوتا جا رہا تھا۔ کچھ بعد میں یہ مرکز ترقی کر کے ان کلچرل مرکزوں کی حد تک پہنچ گیا کہ اس کی زندگی کے ہر شعبے اور رخ میں شیعیت کا عکس نظر آنے لگا۔ شیعہ سنی مسلکی جھگڑے کبھی کبھی لکھنؤ میں پھوٹ پڑتے تھے۔

ان دو فرقوں میں جھگڑے کی جڑ سالانہ محرم کی رسومات ہوتی تھیں، جسے ڈونالڈسن نے شیعوں کی سب سے امتیازی اور سب سے زیادہ جانی پہچانی روایتوں میں سے ایک روایت کہا[3] ہے۔ ۱۰ محرم جسے عاشورہ بھی کہتے ہیں، جس دن یزیدی فوج کے ہاتھوں حسینؓ کی شہادت ہوئی، شیعوں کا اس سے گہرا عقیدتمندانہ تعلق پیدا ہو گیا۔ پوری دنیا میں، خصوصاً شیعوں میں محرم کے پہلے دس دن سوگ کے دن مانے جاتے ہیں۔ ابو بویہ کا معزّ الدولہ (۹۴۵ تا ۹۶۷ء) جو بغداد میں عباسیوں سے منحرف ہوا، اس نے ۹۴۵ء میں محرم کی روایات منانے کی ابتدا کی۔ جب محرم شروع ہوتا تھا تو ''بازار بند کر دیے جاتے تھے، قصائی اپنا کاروبار بند کر دیتے تھے، باورچی کھانا پکانا چھوڑ دیتے تھے، ٹنکیاں (Cisterns) (غالباً حمام) کا ساز و سامان ہٹا دیا جاتا تھا، گھڑوں پر نمدے کے ڈھکن ڈھک دیئے جاتے تھے، عورتیں بالوں کی لٹیں گرا دیتی تھیں، چہروں پر سیاہی لگا لیتی تھیں، پھٹے پرانے کپڑے پہنتی تھیں، اپنے

۱۔ براؤن، ای۔ جی۔ اے لٹریری ہسٹری آف پرشیا III، ص ۴۵۶، ۱۷، ص ۶۴ ۲۔ ہولسٹر جے۔ این، سابقہ حوالہ (؟) ص ۱۲۷
۳۔ ڈونالڈسن۔ ڈی۔ ایم، دی شیعائٹ ریلیجن، ص ۲۷۷

چہروں پر طمانچے مارتی تھیں اور حسینؑ پر روتی تھیں۔''[۱]

شیعیت کے فروغ کے ساتھ محرم کی روایات دنیا کے دوسرے حصوں میں پہنچیں۔ برطانوی ہندوستان محرم کے سلسلے میں سب سے اہم مرکز ہوگیا جہاں اس کی رسوم و روایات بڑے منظم انداز میں منائی جانے لگیں۔ کچھ اور بعد میں تو ان روایات کی شناخت لکھنؤ سے وابستہ ہوگئی اور یہ روایات بہت سے لوگوں کی توجہ کا مرکز بن گئیں۔ پورے ماہ محرم میں مجلسیں ہوتی تھیں جن میں حسنؑ اور حسینؑ کی وفات پر مرثیے پڑھے جاتے تھے۔ (مجلس کے آخر میں تبرا پڑھا جاتا تھا)۔ تبرے کی سنّی مخالفت کرتے تھے، چونکہ ان کے نزدیک پہلے چار خلیفہ محترم تھے اور انہوں نے اسلام کی بہت خدمت کی تھی۔ ان اختلافات کے باوجود ہندوستان میں سنّی مسلمان بعض جگہوں پر جیسے دکن، بہار، اتر پردیش، بنگال میں شیعوں سے زیادہ محرم مناتے تھے، جو غالباً ایران سے متاثر مسلمانوں کا اثر تھا۔ اسٹیفس مین نے اطلاع دی کہ: ''دہلی میں مجلسوں میں شیعہ سنّی بلکہ ہندو بھی شرکت کرتے ہیں''۔[۲] ہولسٹر نے لکھا ہے: ''اگر مجلس میں بہت سے شیعوں نے شرکت کی تھی تو ان سے زیادہ ہندو شریک تھے''۔[۳] یہ بھی قابل ذکر بات ہے کہ محرم کی روایات میں مسلمانوں کے مختلف خیالات رکھنے والے لوگ شریک ہوتے ہیں، گو کہ یہ تعداد محدود ہے۔ بہار میں حسنؑ اور حسینؑ کو بہت محترم اور معزز مانا جاتا ہے۔ بے اولاد ہندو حسنؑ اور حسینؑ کے نام پر منّت مانتے ہیں کہ اگر ان کے یہاں لڑکا پیدا ہوگا تو وہ محرم میں 'پیک' کی خدمت انجام دے گا۔ بتایا جاتا ہے کہ در بھنگا میں ہندو بڑی خواہش کے ساتھ محرم کی رسوم کو منظم کرنے کی ذمے داری لیتے ہیں۔[۴] بڑودہ کے گیکواڑ اور گوالیار کے سندھیا محرم کی رسومات میں حصہ لیتے تھے اور ان کی سرپرستی میں مجلس ہوتی تھی۔[۵]

بہرطور، سنّی شیعوں کے درمیان جھگڑے کی اصل جڑ وہی مدح صحابہ، یعنی پہلے تین خلفاء کی تعریف کرنا اور تبرا یعنی شیعوں کی طرف سے ان پر عام لوگوں کے سامنے لعن کہنا ہی رہی ہے۔

۱۹۰۴ء سے ۱۹۰۹ء تک جگہ جگہ یہ فسادات ایک مستقل سا سلسلہ بن گئے جس کے لیے یوپی کی حکومت کو اس صورت حال کا جائزہ لینے اور اصلاحی اقدامات تجویز کرنے کے لیے ایک کمیٹی تشکیل

۱۔ بخش۔ ایس۔ قدا، دی ریناسانس آف اسلام (Is. cul. H) ص ۴۲۳ ۲۔ دی اسٹیٹس مین، دہلی، اپریل، ۲۴۔ ۱۹۳۴

۳۔ ہولسٹر جے۔ این، سابقہ حوالہ ۴۔ ٹی۔ آئی۔ آر، بنگال اینڈ اوڑیسہ ۱۹۱۱ء، ج ۷، ص ۲۵۲

۵۔ اومان۔ جے۔ سی، دی برہمنس، تھیسس، اینڈ مسلمس آف انڈیا، پارٹ (Ch.I. III) نیز دیکھئے مسلمین ان اودھ، ڈبلیو۔ ایچ۔ سیلمین کی کتاب، اے جرنی تھرو دی کنگڈم آف اودھ ان (OUP 1971) 1849-50

کرنی پڑی۔ نتیجتاً ۱۹۰۹ء میں حکومت کو احتیاطی تدبیر کے طور پر مدح صحابہ اور تبرا دونوں کو عوام میں کہنے پر پابندی لگانی پڑی۔ یہ پابندی تین موقعوں پر عائد کی گئی جس میں عام طور پر جھگڑے ہوتے تھے۔ یعنی عاشورہ، چہلم اور ۲۱ رمضان۔ ان تین موقعوں کے علاوہ اگر اس رسم کو ادا کیا جانا ہوتا تو انتظامیہ سے پہلے سے اجازت لینی پڑتی تھی تاکہ نقضِ امن کا مسئلہ نہ پیدا ہو۔

۱۹۳۵ء میں اس مسئلے نے اس وقت پھر سر ابھارا جب دو سنّی مسلمانوں نے عام لوگوں کے سامنے مدح صحابہ پڑھنی شروع کردی، بہرحال حالات کو بگڑنے سے اس طرح بچایا گیا کہ ان دونوں کو گرفتار کرلیا گیا۔ پھر اسی سال سنّی مسلمانوں نے 'بارہ وفات' کا جلوس نکالنے کی اجازت مانگی لیکن حکام نے دونوں فرقوں میں بڑھتے ہوئے تناؤ کے مدّنظر اجازت نہیں دی۔ اس کے بعد پھر یہ کوشش کی گئی کہ کسی قسم کی آپسی صلح و صفائی سے یہ مسئلہ دونوں فرقوں کے درمیان دوستانہ انداز میں طے کرکے اس تناؤ کو ختم کردیا جائے، مگر یہ کوشش ناکام ہوئی۔ آخر حکومت نے الہ آباد ہائی کورٹ کے ایک جج السوپ (Allsopp) کی سربراہی میں ایک عدالتی انکوائری کمیٹی تشکیل دی تاکہ وہ اس مسئلے کا بغور مطالعہ کرے اور موجودہ حالات کی معلومات حاصل کرے۔

کمیٹی نے مدح صحابہ اور تبرے پر پابندی کے احکامات کو جاری رکھنے کی سفارش کی۔ وقتی طور پر تو حکام فسادات کو روکنے میں کامیاب ہوگئے مگر ۱۹۳۹ء میں فسادات پھر شروع ہوگئے کیونکہ فریقین مطمئن نہیں تھے۔

۱۹۳۹ء میں یوپی کی حکومت نے مدح صحابہ اور بارہ وفات پر جلوس نکالنے کی اجازت دے دی۔ اس سے پھر پریشانیاں کھڑی ہوگئیں اور دونوں فرقوں کے درمیان پھر فسادات ہونے کے امکانات بہت واضح ہونے لگے۔ اس کے بعد سے یہ جھگڑے ایک مستقل سی صورت اختیار کرگئے اور ہر موقعے پر کچھ اموات بھی ہوجاتی تھیں۔ اس صورت حال میں کچھ اور اطراف سے سیاسی مداخلت نے حالات کو اور بگاڑا۔[۱] احرار، جو ایک سنّی قوم پرست (نیشنلسٹ) رجحان رکھتے تھے انہوں نے سنّیوں کی حمایت کی۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ خاکساروں نے اس قضیے کا دوستانہ انداز میں فیصلہ کرنے کی

۱۔ دونوں فرقوں، خصوصاً شیعہ فرقے کے لوگ، اترپردیش کے مختلف علاقوں سے ان فسادزدہ علاقوں میں بڑی تعداد میں آنا شروع ہوئے تاکہ اپنے اپنے فرقوں کی مدد کرسکیں۔ دی اسٹیٹس مین، جولائی ۱، ۱۹۳۹ء ص ۱۰، دی اسٹیٹس مین، اگست ۱۸، ۱۹۳۹ء، اطلاع دی گئی ہے کہ لگ بھگ ۱۷۰۰ شیعوں نے اس سلسلے میں گرفتاری دی۔ دی اسٹیٹس مین، اگست ۲۹، ۱۹۳۹

پیش کش کی۔ ۱۹۴۵ء میں مدح صحابہ پر پابندی کو توڑنے کے سلسلے میں بتیس سنّی مسلمان گرفتار ہوئے۔[۱] جان ہولسٹر کا خیال تھا کہ ''مستقبل میں دونوں فرقوں کے صرف ان رہنماؤں سے کچھ امید کی جاسکتی ہے جنہوں نے متواتر صبر وتحمل سے کام لیا ہے اور ایک وقتی یا جزوی فتح کے مقابلے میں کل کی بہتری پر نگاہ رکھی ہے۔ صرف اسی روح اور جذبے کے ساتھ بڑی اکائیوں کی بہترین کامیابی حاصل کی جاسکتی ہے''۔[۲]

۱۹۱۱ء کی مردم شماری سے ہمیں سنّی اور شیعہ مسلمانوں کا شمار بھی ملنا شروع ہوجاتا ہے۔ ۱۹۲۱ء کی مردم شماری میں آسام میں سب سے کم شیعہ تھے اور سب سے زیادہ پنجاب اور دہلی میں تھے۔ بڑودہ میں مسلمان آبادی میں شیعوں کا تناسب سب سے زیادہ تھا۔[۳] حیدرآباد، لکھنؤ، فیض آباد، جون پور، رامپور، امروہہ، احمد آباد، ہگلی اور مرشد آباد وغیرہ وہ چند جگہیں ہیں جہاں شیعہ کسی قدر زیادہ تعداد میں ہیں۔ اس لیے یہاں سنّی شیعہ فساد ہونے کا امکان زیادہ ہوسکتا تھا۔

شیعہ سنّی جھڑپوں کے علاوہ خود سنّیوں میں بھی جھگڑوں کی کچھ مثالیں نظر آتی ہیں۔ بہار میں سنّی بڑے جوش وخروش اور جذباتی اٹھان کے ساتھ محرم مناتے ہیں۔ میرے آبائی وطن سیوان اور اس کے قرب و جوار کے اضلاع جیسے گوپال گنج، چھپرا وغیرہ میں جہاں زیادہ تر سنّی آباد ہیں، وہاں کے سنّی مسلمان محرم کی رسومات کو بڑی اہمیت دیتے ہیں۔ جب میں نے محرم کی اہمیت کے بارے میں پوچھا تو لوگوں نے بڑے جذباتی اور غمگین انداز میں جواب دیا کہ: ''یہ اسلام کا سب سے اہم واقعہ ہے اور یہ ہماری زندگی میں سب سے اہم حیثیت رکھتا ہے''۔ کچھ لوگوں کے لیے یہ اسلام کے ستونوں (ارکان) جتنا اہم ہے۔ یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ سیوان اور آس پاس کے علاقے میں کچھ گاؤں ایسے بھی ہیں جو عیدالفطر یا عیدالاضحیٰ منانے سیوان نہیں آتے لیکن وہ محرم، یعنی عاشورہ منانے ہر سال بلا ناغہ آتے ہیں۔

جب میں نے ایک بزرگ سے پوچھا کہ محرم آپ کے لیے کیوں اہمیت رکھتا ہے تو انہوں نے جواب دیا: ''اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد''۔ اس کے بعد انہوں نے کہا کہ: ''ہمارے لیے اہل بیت سے زیادہ کوئی اور عزیز اور اہم نہیں ہے، کیونکہ انہوں نے اسلام کی عظمت کو بچانے کے لیے اپنی جانیں قربان کردیں۔ اسی لیے وہ ہمارے لیے نمونہ بن گئے''۔

۱۔ دی ہندوستان ٹائمس، مارچ ۱، ۱۹۴۵ ۲۔ ہولسٹر، جان نارمین، سابقہ حوالہ، ص ۱۹۰ ۳۔ ایضاً، ص ۸۲۰

جب میں نے اتنے بڑے پیمانے پر محرم کے جلوس کو منظم کرنے کے لیے ذرائع کے بارے میں سوال کیا اور پوچھا کہ جب ہر گاؤں اس کو الگ منظم کرتا ہے تو اس کے بہت زبردست اخراجات ہوتے ہوں گے تو بتایا گیا کہ: ''ہم آپس میں چندہ کرتے ہیں اور اس سلسلے میں خاص طور پر عورتیں اتنی جذباتی ہوجاتی ہیں کہ وہ اپنے زیور تک چندے میں دے دیتی ہیں۔ اس کے لیے شہروں میں رہنے والوں، بلکہ غیر ملکوں میں رہنے والوں سے بھی چندہ لیا جاتا ہے۔ یہ پیسہ عام طور پر تعزیہ، سپر، دُلدُل، علم اور جلوس کو منظم کرنے میں خرچ کیا جاتا ہے''۔

بچپن میں میں نے خود یہ سب کچھ دیکھا ہے بلکہ اس کے بارے میں کچھ جانے سمجھے بغیر بڑے انہماک سے اس میں حصہ بھی لیا ہے۔ مجھے یاد ہے ہر شخص اس وقت یا علی یا حسین ایک خاص انداز میں دوہراتا تھا کہ اس سے خود بخود ایک غمگین سا ماحول بن جاتا تھا۔ یہ شیعہ ماتم سے بالکل مختلف ہے۔ ایسے گرم جذباتی ماحول میں جارحیت پیدا ہونے کے امکانات ہوجاتے ہیں، خاص طور پر جب اس میں اَنا، شناخت اور امتیاز کا جذبہ بھی شامل ہوجائے۔

شیعہ سنّی فساد سے بچنے کے لیے اور الگ الگ گاؤں میں رہنے والے سنّی گروہوں میں، جو فرقہ وارانہ تشدد کے ویسے ہی شکار رہتے ہیں، ان کی آپسی چپقلشوں پر قابو رکھنے کی غرض سے انتظامیہ متواتر احتیاطی اقدامات اٹھاتا رہتا تھا۔ جیسے جلوس کے راستے مقرر کرنا، علاقے کے مقتدر اور جانے پہچانے لوگوں کی کمیٹیاں بنانا جن میں شیعہ، سنّی اور انتظامیہ کے افراد کے ساتھ ہندو بھی ہوتے تھے۔ یہ دیکھا گیا کہ عام طور پر جھگڑا اس اَنا پسندی کی وجہ سے شروع ہوتا ہے کہ کسی خاص گاؤں کا علم اور جلوس آگے رکھا جائے۔ جلوسوں کے راستے لگ بھگ طے ہوچکے ہیں۔ اِن میں ذرا سی تبدیلی بھی جھگڑے کا سبب بن جاتی ہے۔ پھر شناخت کا مسئلہ ہے، مثال کے طور پر مختلف گاؤں والوں کو اس بات پر جھگڑتے دیکھا جاتا ہے کہ ہمارے علم کو پہلا اور بہترین مانا جانا چاہیئے۔ اس میں ذات پات کا شاخسانہ بھی کبھی کبھی نکل آتا ہے۔ یہ فساد عام طور پر تعلیم کی کمی یا جہالت کی وجہ سے اٹھتے ہیں۔ اس طرح بہار، بنگال اور اتر پردیش میں سنّی مسلمانوں کے لیے عاشورہ کا دن ایک مخصوص اہمیت کا حامل ہے اور یہ وہ موقع ہے، جس میں شہیدوں کو یاد کرکے خراج عقیدت پیش کرسکتے ہیں جس سے انہیں ثواب ملے گا۔

محرم کو روایت کے ایک حصے کے طور پر منایا جاتا ہے۔ سیوان اور اس کے اطراف کے ضلعوں کے

کچھ گاؤں جیسے حسن پورہ، بالیٹھا، میر گنج، برہاریہ وغیرہ، جہاں عزاداری کے جلوس جس بڑے پیمانے پر نکلتے ہیں وہ ایک طرح سے طاقت کا بھی مظاہرہ ہوتا ہے۔ میں نے بالیٹھا کے شمشاد صاحب سے اس طاقت کے مظاہرے کی بابت پوچھا تو وہ کافی جذباتی ہوگئے اور انہوں نے جواب دیا: ''ٹھیک ہے یہ غم کا موقع ہوتا ہے، لیکن اس کے ساتھ ہی یہ ہمیں ہمت و جرأت، بہادری، صدق دلی، لگن، دین سے محبت اور اسلام کے لیے قربانی کا جذبہ جس کا مظاہرہ اہل بیتؑ نے کربلا میں کیا، یہ سب کچھ بھی سکھاتا ہے، حالانکہ امام حسینؑ یزیدی فوج کی تعداد اور طاقت کو اچھی طرح جانتے تھے۔ اس لیے ہمیں بھی کسی مقصد کے تحت طاقت کا مظاہرہ کرتے رہنا چاہیئے''۔

سیوان میں سنّی مسلمان اکثریت میں ہیں اور وہ امام حسینؑ کی یاد میں بڑے جذبے اور جوش و خروش کے ساتھ عزاداری کرتے ہیں۔ میں نے پوچھا کہ اتنے مقدس موقعے پر خود اپنے ہی فرقے کے درمیان تشدد اور جھگڑوں کی کیا وجہ ہے؟ ابوالحسن صرف جلوس کی تنظیم میں ہی بہت زیادہ منہمک نہیں رہتے بلکہ وہ پورے سلسلے کو شروع سے آخر تک منظم کرتے ہیں۔ اگر کبھی کوئی تکرار یا تشدد پھوٹ پڑتا ہے تو ترجمان یا ثالث کی حیثیت سے انہی کی سب سے زیادہ مانگ ہوتی ہے۔ انہوں نے میرے سوال کے جواب میں کہا: ''جذبات کی اتنی انتہا میں کچھ بھی ہونا ممکن ہے۔ جوش عقیدت ایک وجہ ہے''۔

اسی سوال کے جواب میں ایک مقامی اسکول کے استاد نے کہا: ''محرم کا جوش و جذبہ، غیر تعلیم یافتہ طبقے میں قابو سے باہر ہوتا ہے۔ اس کی وجہ سے آپس میں کلیش ہوتا ہے''۔

میں عزاداری کو منظم کرنے والے بہت سے لوگوں سے ملا۔ جب میں نے سوال کیا کہ بہار میں محرم اتنا مقبول کیوں ہے؟ تو ان کے جواب کم و بیش انہی خطوط پر تھے۔ پہلی بات یہ کہ محرم ہماری روایت کا حصہ ہے، دوسرے بریلوی اثر بھی اس کا ایک اہم عنصر ہے، تیسرے خوش حالی جو پیٹرو ڈالر کی دین ہے، چونکہ وسط ایشیا میں کافی تعداد میں لوگ اچھے پیسے کمارہے ہیں اور یہ لوگ محرم کی روایات کی تنظیم میں دل کھول کر مالی مدد دے رہے ہیں۔

ملک کے نوآبادیاتی دور میں شیعہ اور سنّی دونوں کی عزاداری روایات میں کچھ علامتی اہمیت بھی تھی۔ محرم خود ایک علامت ہے امام حسینؑ کی طرف سے برائی کی طاقتوں، ناانصافیوں اور سب سے زیادہ حق اور ناحق کے درمیان جنگ کی۔ امام حسینؑ نے اسلام کی حفاظت میں ابھرتی ہوئی باطل کی

طاقتوں اور خصوصاً خلافت کو ملوکیت میں تبدیل کر دینے کے خلاف جنگ کی اور شہادت پائی۔ مولانا محمد علی جوہر نے اپنے مشہور شعر میں یہی کہا ہے:

قتلِ حسینؑ اصل میں مرگِ یزید ہے
اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

ہندوستان میں انیسویں صدی کے دوسرے نصف حصے میں برطانوی حکومت کی ناانصافیوں اور غلط پالیسیوں کے خلاف ایک جد و جہد شروع ہوئی۔ برطانوی حکومت سے اس جنگ کے دوران غالباً محرم کا کچھ ورثہ متحدہ طور پر اپنایا گیا تھا۔ محرم کے جلوسوں میں بلاتفریق ذات، نسل اور مذہبی خیالات، معاشرے کے عام طبقے شریک ہوتے تھے۔ اس سے ایکتا کا ایک احساس پھولا پھلا۔ امام حسینؑ کے نام سے کم سے کم ایک نقطۂ اتحاد حاصل ہوا۔ اس نے عارضی طور پر مسلمانوں کے تمام مسلکوں اور ہندوؤں کو ایک پلیٹ فارم پر لے آنے کے لیے اتحادی طاقت کا کام کیا۔ یہ ملک میں برطانوی تسلط کے لیے ایک خطرہ بھی ثابت ہوسکتا تھا، اس اتحاد کا اظہار ۱۸۵۷ء کی بغاوت میں ہو چکا تھا، اس لیے حکومت برطانیہ کے لیے یہ ضروری ہوگیا کہ وہ مذہب، ذات پات، نسل اور مسلکوں کے نام پر اختلاف و نفاق کا بیج بودیں۔ یہ کام انہوں نے انتہائی کامیابی کے ساتھ انجام دیا، جو ۱۸۵۷ء کی بغاوت کے بعد رونما ہونے والے فرقہ وارانہ اور مسلکی فسادات میں نظر آتا ہے۔

محرم کی کچھ علامتی اہمیتوں میں ایک بہت خاص اہمیت کی حامل ''اکھاڑے'' کی روایت ہے جس نے بنیادی تربیتی میدان کا کام انجام دیا۔ اکھاڑے کی تیاری مہینوں پہلے سے شروع ہوجاتی تھی۔ یہ جنگ کے بڑے پرانے طریقوں، لاٹھی، بھالے، تلواروں وغیرہ سے لڑنے کی تربیت فراہم کرتی تھی۔ ان اکھاڑوں سے فوجی قسم کے کھیلوں میں تربیت یافتہ لوگ ۱۸۵۷ء کی بغاوت میں شامل ہوئے تھے۔ انہوں نے فرانسی شورش، اور برطانویوں سے وہابیوں کی جنگ میں محرم میں حاصل کیے تجربات کی بدولت ہی بہادری کا مظاہرہ کیا تھا۔ محرم کی علامتی اہمیت اور اس کے عملی، یا تجربے کے رخ سے برطانوی حاکم چونک گئے اور انہوں نے اپنی ''بانٹو اور راج کرو'' کی پالیسی کو بروئے کار لانا شروع کر دیا۔ اس کے نتیجے میں مسلکی اور فرقہ وارانہ فساد کھڑے ہوئے۔ چنانچہ ہمیں صاف طور پر نظر آتا ہے کہ بیسویں صدی میں شیعہ سنی اور ہندو مسلم فسادات کے واقعات میں اضافہ ہوا۔ یہ ٹکراؤ آزادی کے بعد بھی جاری رہے۔ لکھنؤ اور دوسری جگہوں پر ہوئے کچھ بہت سنگین فسادات کی رپورٹیں بھی

موجود ہیں۔ شیعوں اور سنّیوں میں اس تناؤ کو کچھ کم کرنے کا واحد راستہ تعلیم ہی ہے۔

شاہ عبدالعزیز نے اپنی مشہور کتاب ''تحفہ'' میں جس کی تالیف ۱۷۸۹ء میں ہوئی تھی، شیعوں کی تاریخ اور عقائد اور تعلیمات کو بیان کیا ہے۔ انہوں نے بتایا ہے کہ یہ کتاب اس وقت لکھی گئی جب شیعیت ہر سنّی گھر میں سرایت کرگئی تھی۔ ان کا بیان ہے کہ مشکل سے ہی کوئی گھر ایسا بچا ہوگا جس میں کچھ افراد شیعہ نہ ہوگئے ہوں اور اس دور میں بہت سے مسائل پر شیعہ سنّی علماء کے درمیان بہت سخت مباحثہ چل رہا تھا۔ سنّی شیعہ فرقوں میں اختلافات اتنی شدت اختیار کرگئے تھے کہ کبھی کبھی ایک فرقہ دوسرے فرقے کو دائرۂ اسلام سے خارج ماننے لگتا تھا۔ فتووں اور ملفوظات میں ہمیں شادی اور عام تعلقات کے بارے میں شیعوں کی حیثیت پر سوالات نظر آتے ہیں۔ شاہ عبدالعزیز انہیں خارج از اسلام تو نہیں سمجھتے تھے مگر وہ ان سے عام سماجی تعلقات سے گریز کو ترجیح دیتے تھے۔ شاہ عبدالعزیز کی کوششوں سے ان دو فرقوں کے درمیان تناتنی ضرور کم ہوئی۔[۱]

نتائج

شیعہ سنّی ٹکراؤ کو روکا جاسکتا ہے اور دونوں فرقوں کو متحد کیا جاسکتا ہے۔ پہلے جدید سائنسی تعلیم کا شعور اور اس کے فوائد سے انہیں آگاہ کرکے اور دوسرے دونوں فرقوں کے لوگوں کو، جن میں علماء بھی شامل ہوں، (حقیقی) مذہبی تعلیم دے کر، جس میں مذہبی اعمال پر زیادہ زور دیا جائے۔ متنازعہ فیہ مسائل اور تاریخ کے وہ دور جن سے زیادتیوں کی ابتدا ہوئی ان پر بڑے ٹھنڈے دل اور سکون سے بحث و مباحثے کے ذریعے اختلافات و تضادات کا حل نکالنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ تیسرے حکومت اور انتظامیہ کو عزاداری کے مذہبی جلوسوں کے تئیں فراخدلانہ رویہ اختیار کرنا چاہیئے۔ شیعوں اور سنّیوں کو ترقیاتی امور، سماجی ترقی کے کاموں، مقامی انتظامیہ (لوکل باڈیز)، سرکاری منصوبوں کے بارے میں زیادہ سے زیادہ معلومات بہم پہونچانا اور انہیں ان میں منہمک کیے جانے وغیرہ کو ترجیح دی جانی چاہیئے اور کم ترقی یافتہ اور پچھڑے ہوئے علاقوں میں اس پر خصوصی توجہ دینی چاہیئے۔ چوتھے دونوں فرقوں کی الگ الگ یا ملی جلی، ایسی غیر سرکاری تنظیمیں قائم کرنی چاہئیں جن سے ان کے سماجی حالات میں بہتری پیدا کی جاسکے۔ تکنیکی اور پیشہ ورانہ تربیتی مراکز اور ایسے پرائیویٹ اسکول کھولنے چاہئیں جو معیاری تعلیم دیں اور ساتھ ہی مذہبی تعلیمی ادارے بھی قائم کیے جانے چاہئیں۔

۱۔ مشیرالحق، شاہ عبدالعزیز، ہز لائف اینڈ ٹائم، ص ۲۲-۲۱